محمد حنیف ندوی

فہمِ قرآن

(۲)

قرآن حکیم کے یہ موٹے موٹے اور بنیادی موضوع ہیں۔ ان کا ذکر استقصار کی نیت سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس نیت سے کیا گیا ہے کہ قاری کو تفہیم سے بے نیاز ہو کر قرآن کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور غور و فکر کے مقامات سے یونہی کچھ اپنے دامن میں ڈالے بغیر گذر جانا نہیں چاہیے۔ بلکہ ہر ہر موضوع اور مضمون کے شایانِ شان استفادہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ورنہ جہاں تک اس کے مضامینِ رنگا رنگ کی وسعتوں کا تعلق ہے اس کا احاطہ کس نے کیا ہے؟

قل لو کان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا (کہف ۱۰۹)

کہہ دو اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کو لکھنے کی سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جاتے اگرچہ ویسا ہی اور سمندر ہم اس کی مدد کو لائیں۔

غرض یہ ہے کہ کسی نہ کسی حد تک انسان کو تفہیم و ادراک سے کام لینا ہی چاہیے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں ان کا شمار ان محرومانِ قسمت اور تہی دامانِ نصیب لوگوں میں نہ ہو جن کے بارے میں کہا گیا ہے

ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک - قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفا - اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبھم -

(محمد - ۱۶)

اور انہیں میں بعض ایسے ہیں کہ جو تمہاری طرف کان لگائے رہتے ہیں یہاں تک کہ سب کچھ سنتے ہیں لیکن جب تمہارے پاس سے نکل کر چلے جاتے ہیں تو جن لوگوں کو علم دین دیا گیا ہے ان سے کہتے ہیں کہ ابھی انہوں نے کیا کہا تھا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا رکھی ہے۔

یہاں تک تو ان مثبت تقاضوں کا تعلق تھا جن کا پورا کرنا قاری کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ موانع بھی ہیں جو فہم قرآن کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ ان سے دست کشی لازم

ہے۔ غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار ہیں۔

۵۔ دست کشی یعنی فہم قرآن کے سلسلہ میں کن چیزوں سے دست کش ہونا چاہیے

۱۔ قرأت و تجوید میں غلو۔ بعض قراء کی ساری کوششیں صرف اسی بات پر مرکوز رہی ہیں کہ کسی طرح حروف کی تحقیق و ادا کے فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوں۔ ان کی توجہ چونکہ تمام تر الفاظ و حروف ہی کے مخارج پر مبذول رہتی ہے اور یہ ایسی چیز کے درپے رہتے ہیں کہ حلق کے لوچ اور آواز کے زیر و بم کو کیونکر موسیقی میں بدلا جا سکتا ہے اس لیے معانی کا انکشاف ان پر کم ہی ہو پاتا ہے۔ اس شخص کی مثال ایسے دیوانے کی ہے جو برتن کو خوب دھوتا اور مانجھتا ہے۔ مگر اس میں جو غذا اور کھانا ہے اس سے اپنی گرسنگی دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

۲۔ تقلید! جب کوئی شخص بغیر ذاتی بصیرت اور مشاہدہ کے بعض افکار و مسموعات کی حقانیت پر یقین رکھتا ہے اور ان پر بُری طرح جم جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک نوع کی تنگ نظری اور تعصب ابھر آتا ہے۔ اور وہ اس لائق نہیں رہتا کہ حقائق قرآنی تک رسائی حاصل کر سکے۔ کیونکہ یہ چیز تقلید سے حاصل ہونے والی نہیں۔ اس کی نفسیات کچھ اس ڈھنگ کی ہو جاتی ہیں کہ ہر ہر بات کو اپنے ہی آباؤ اجداد کے معیار پر جانچ کر دیکھتا ہے۔ اور نفس مسئلہ پر غور نہیں کر پاتا۔ ظاہر ہے اس حالت میں قرآن اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرآن تو ذاتی بصیرت و مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے اور ایسے حقائق و معارف کی طرف بلاتا ہے۔ جو فکر و عمل کی کاوش اور جدوجہد کے متقاضی ہیں۔ یہی مطلب ہے صوفیاء کے اس قول کا

انّ العلم حجابٌ۔ علم بھی ایک پردہ ہے

یعنی ایسا علم جو تقلید سے حاصل ہو۔ جو جدلیات و مناظرہ کا نتیجہ ہو۔ حقیقی اور سچا علم نہیں۔ اس سے بڑھ کر کشفِ حقائق کا مانع اور کون ہو سکتا ہے۔ تقلید کی دو صورتیں ہیں۔ اور دونوں غلط ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق غیر صحیح عقیدہ سے ہو۔ مثلاً ایک شخص کو استواء علی العرش کے معنی یہی یاد کرائے گئے ہیں کہ اس سے مراد جسمانی تمکن و استقرار ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح متمکن ہے جس طرح ایک انسان تخت پر بیٹھتا ہے۔ تو اس کے سامنے ہزار تنزیہہ کی آیات پیش کیجیے یہ ان سے از راہ تقلید متاثر نہیں ہوگا۔ اور اسی پہلے عقیدہ پر جما رہے گا۔

دوسرے یہ کہ اس کا تعلق ایک صحیح عقیدہ سے ہو۔ اس میں یہ قباحت ہے کہ چونکہ

اس کا علم تقلیدی ہے تحقیقی نہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کے دوسرے باریک اور نازک پہلو اس کی نظروں سے اوجھل رہیں گے۔

اور وہ یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ علم کے کئی درجے ہیں۔ یعنی علم کبھی کسی مسئلہ کے صرف ظاہر ہی سے متعرض ہوتا ہے اور کبھی اس کے باطن کو بھی گیرلینے کی جد وجہد کرتا ہے۔ اور مقلد نے چونکہ صرف ظاہری رخ کی جھلک ہی دیکھی ہے۔ اور اس پر مطمئن ہے۔ اس لیے بالطبع اس کے لیے باطنی اسرار تک پہنچنا دشوار ہے۔

۳۔ ہجوم شہوات۔ معانی قرآن کے فہم وتدبر میں ایک بہت بڑا مانع بدعملی بھی ہے۔ جب کوئی شخص گناہوں پر اصرار کرے، کبر وغرور کو اپنائے اور معصیت کے ارتکاب پر اترآئے اور اصرار کرے تو اس پر قرآن فہمی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شہوات اور ہوائے نفس کی پیروی سے آئینۂ قلب زنگار آلود ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس پر قرآن کے معانی ومطالب منعکس ہو سکیں۔ حدیث میں ہے

واذا عظمت امتی الدنیا والدراھم	جب میری امت نے درہم ودینار کو زیادہ اہمیت دینا
نزع منھا ھیبۃ الاسلام واذا ترکوا	شروع کی، ان کے دلوں سے اسلام کی ہیبت نکل گئی۔ اور
الامر بالمعروف والنھی عن المنکر	جب اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے
حرموا برکت الوحی۔	منہ موڑا تو وحی کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔

حضرت فضیل کا کہنا ہے وحی کی برکتوں سے محروم ہونے کے معنی فہم قرآن سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ نیکی اور قلب کی صلاحیتوں کو فہم قرآن میں دخل ہے۔ اس پر خود قرآن نے جابجا روشنی ڈالی ہے

تبصرۃً وذکریٰ لکل عبد منیب۔	تاکہ رجوع لانے والے ہر بندے ہدایت اور نصیحت حاصل کریں۔
وما یتذکر الا من ینیب۔	اور نصیحت تو وہی پکڑتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے
انما یتذکر اولوا الالباب۔	اور سمجھتے تو وہی ہیں جو عقل مند ہیں۔

عقل ودانش کے بارہ میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے۔ کہ اس سے مراد وہ عملی صلاحیتیں نہیں ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص مزخرفات دنیا کو حاصل کرنے کی تگ ودو کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود وہ بصیرت ہے جس

---

(۱) ابن الدنیا

کے سبب دنیا کے مقابلہ میں آخرت وعقبیٰ کی قدر وقیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ تفسیر ظاہری پر انحصار۔ قرآن کی تعبیر وتفسیر کے کئی پہلو ہیں۔ اس لیے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ تفسیر کا وہی حصہ مستند اور صحیح ہے جو ظاہر الفاظ سے متعلق ہے۔ اور جو ابن عباس، مجاہد یا عکرمہ وغیرہ سے متعلق ہے اور اس کے باطن اور روحانی پہلو درخور اعتنا نہیں۔ یقین رکھیے کہ ایسا شخص قرآن کے اسرار ومعارف سے یکسر محروم ہے۔ اور یہ خیال بھی من جملہ ان حجابات کے ہے کہ جو فہم قرآن کے سلسلہ میں حائل ہوتے ہیں۔

تفہیم ہی کا ایک مرتبہ یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والا ہر ہر حکم اور ہر ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو قرار دے۔ اسے تخصیص کہتے ہیں۔ یعنی کسی امر کے بارہ میں پڑھے تو اس سے داعیہ عمل بیدار ہو۔ جب نہی پر مشتمل آیات کا مطالعہ کرے تو گناہوں سے نفرت کے جذبات بیدار ہوں۔ اسی طرح انبیاء کے قصص واحوال کی تلاوت کرے تو ان میں تذکیر واعتبار کے پہلوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ نے ان کو محض بطور کہانی کے بیان کیا ہے۔ اسی کیفیت تفہیم کو قرآن نے تثبت سے تعبیر فرمایا ہے

ما نثبت بہ فوادك۔ — اس سے ہم تمہارے تثبت کا اہتمام کرتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ نزول قرآن کا سبب یہ قرار دے کہ بغیر کسی استثناء کے اس کے مخاطب تمام افراد اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی اصلاح مقصود ومطلوب ہے۔

"واذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ یعظکم بہ" — اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں۔ جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے وہ یاد کرو۔

لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون۔ — ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔

ھذا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون ٥ (جاثیہ - ۲۰) — یہ قرآن لوگوں سے دانائی کی باتیں ہیں۔ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

اسی حقیقت کو محمد بن کعب القرظی کی چشم بصیرت نے بھانپا۔ اور ان الفاظ میں بیان کیا۔

من بلغہ القرآن فکانما اللہ کلمہ۔ — جس شخص کی قرآن تک رسائی ہو پائی اس نے گویا اللہ سے بات چیت کی۔

اور اسی نکتۂ دلنواز کی طرف مالک بن دینار نے ایک سوال پوچھ کر توجہ دلائی۔

مَا ذرع فی قلوبکم یا اھل القرآن — اے حاملین قرآن یہ تو بتاؤ تمہارے دلوں میں قرآن نے کیا گل بوٹے کھلائے۔ یاد رکھو قرآن مومن کے لیے موسم بہار کی مانند ہے۔

ان القرآن ربیع المومن ....

یعنی جس طرح بہار کے زمانے میں مردہ زمین بھی زندہ ہو جاتی ہے اور اس میں روئیدگی کی مخفی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کی برکت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی رو کش گلستاں ہونا چاہیے۔ اور اس میں بھی ایمان کے برگ و بار پر نکھار آنا چاہیے۔ کیا اس سے یہ مقصد حاصل ہوا۔ اور اس کی تلاوت سے تم نے اپنے دلوں میں کوئی اثر محسوس کیا ؟

۷۔ تاثر

تاثر سے یہ مطلب ہے کہ قاری مختلف مضامین کی آیات سے قلب و ذہن میں ایسی کیفیات پیدا کرے۔ اور اکسائے جو ان مضامین کے عین مطابق ہوں۔ لطف یہ کہ پھر صرف کیفیات ہی پیدا نہ کرے۔ بلکہ ان کے نتیجے میں وجد و حال کے جذبات کو بھی طاری کرنے کی جدوجہد کرے۔ یعنی اگر آیات خوف و خشیت اور حزن و غم کے اسباب پر مشتمل ہوں تو جسم پر رعشہ اور کپکپی کے آثار نمودار ہونا چاہئیں۔ اور اگر مغفرت و بخشش کے وعدوں کے تذکرے ہوں تو سارے جسم میں سرور و انبساط کی لہر دوڑ جانا چاہیے۔ اور ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ قاری نے فی الواقع مسرت و ابتہاج کے دواعی کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کا پورا پورا یقین ہے۔

لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن سے جس درجہ شغف بڑھے گا۔ اور اس کے معارف و مضامین سے جس درجہ واقفیت زیادہ گہری ہوتی جائے گی۔ اسی نسبت سے خوشی و مسرت کے بجائے غم و حزن کی کیفیات سے دل زیادہ متاثر ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب ہدیٰ میں ایسی آیات کی کثرت ہے کہ جن سے گداز، رقت اور سوز کے احوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اگر مغفرت و بخشش کی خوش خبریاں سنائی گئی ہیں تو ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ جن کا ایفا آسان نہیں۔ مثلاً سورہ العصر میں انسان کی محرومیوں کے بارہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جدوجہد اور تگ و دو کے باوجود بالعموم فساد اور گھاٹے کی زندگی ہی بسر کرتا ہے۔ اور اس کے اعمال کا رخ عموماً ہلاکت و بربادی ہی کی طرف رہتا ہے۔ ہاں اس چکر سے اس کا مخلصی حاصل کر لینا بھی ممکن ہے۔ مگر کیونکر اور کن لوگوں کے لیے۔

الا الذین امنوا وعملوا الصالحات و تواصوا بالحق وتواصو بالصبر۔

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

گویا ایمان، عمل صالح اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی چار چار شرطوں کو اس غرض کے لیے پورا کرنا ضروری ہے۔ ان پر غور کیجیے اور بتایئے کیا ان سے نمٹنا آسان ہے؟ اور یہ خوشخبری ایسی ہے کہ بغیر سخت شدائد و محن سے گذرے اس سے کوئی شخص بہرہ مند ہو سکے۔

اسی تاثر کے بارہ میں حسن بصری نے فرمایا

واللہ ما اصبح الیوم عبد یتلوا القرآن یومن بہ الا کثر حزنہ وقل فرحہ وکثر بکاءہ وقل ضحکہ وکثر نصبہ وشغلہ وقلت راحتہ وبطالتہ۔

بخدا جس روز بھی کسی شخص نے قرآن کی تلاوت کی۔ اس کا حزن بڑھ گیا۔ اس کی خوشیاں کم ہوگئیں۔ اس کے نالہ و شیون میں اضافہ ہوا۔ اس کی ہنسی مذاق کا دور ختم ہو گیا۔ اس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کے دائرے وسیع ہو گئے۔ اور راحت و بطالت جاتی رہی۔ بشرطیکہ یہ شخص اس قرآن پر ایمان بھی رکھتا ہو۔

یہی وہ تاثر تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ اہل اللہ قرآن پڑھتے وقت غش کھا کر گر پڑتے۔ اس تاثر کا یہ کرشمہ ہے کہ کچھ اہل دل حضرات سے متعلق ہم سنتے اور پڑھتے ہیں کہ تلاوت کے وقت ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور اگر تاثر کی یہ کیفیات دل میں نہ ابھریں تو پھر قاری کی حیثیت اس سے زیادہ کیا ہے کہ وہ صرف حقائق و واقعات مندرجہ کی حکایت کرنے والا ہے۔ بلکہ ان حقائق کو جھٹلانے والا ہے۔ مثلاً جب وہ کہے گا

قل انی اخاف ان عصیت الی عذاب یوم عظیم۔

کہہ دو اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

اور اس کے دل کا یہ حال ہے کہ خوف و حزن کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا نہیں جاتا۔ تو یہی آیت پکار کر کہے گی۔ جھوٹ بکتا ہے۔

اسی طرح جب کہے گا

علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔ (ممتحنہ ۴)

اے پروردگار تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے۔ اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔ اور تیرے ہی حضور ہمیں لوٹنا ہے۔

اور اس کی حالت سے توکل وانابت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ تو یہی آیت اس کے جھوٹ پر سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

غرضیکہ قرآن تو اس لیے پڑھا جانا چاہیے۔ کہ اس سے یہ کیفیات پیدا ہوں۔ اور یہ احوال وکیفیات نمودار ہوں۔ اور اگر اس سے ادنیٰ تاثر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اور قلب وذہن کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا۔ تو یہ تلاوت نہ ہوئی۔ صرف زبان ہلانا ہوا۔ جو کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس سلسلہ میں اہل اللہ کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس قصہ سے لگائیے۔ ایک قاری کا کہنا ہے میں نے ایک مشہور اور خدا رسیدہ عارف سے قرآن کی چند آیات پڑھیں۔ پھر جب دوبارہ ان کی خدمت میں اعادہ وتکرار کی نیت سے حاضر ہوا تو انہوں نے ڈانٹا

جعلت القرأت علی عملا اذهب فاقرأ علی الله عزو جل — تم نے قرآن کو بھی کوئی دنیاوی کام سمجھ رکھا ہے۔ کہ اس میں صفت وکمال پیدا کرنا خوبی ہے۔ جاؤ جو پڑھا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کرو۔ اور اپنا محاسبہ کرو۔

صحابہ کا نقطۂ نظر بھی تلاوت وحفظ کے بارہ میں یہی تھا۔ کہ وہ محض عمل کی نیت سے پڑھتے اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے یاد کرتے۔ ترتیل وتجوید کے فنی قاعدوں میں کمال پیدا کرنا ان کا مقصود نہ تھا۔

چنانچہ یہ واقعہ کس درجہ حیرت انگیز ہے کہ حضورؐ کا انتقال ہوا ہے۔ بیس ہزار صحابہ میں سے جن کو پورا قرآن یاد تھا ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہ تھی۔ باقی تمام حضرات کو بس ایک آدھ سورۃ ہی یاد تھی۔ یا ان کے بعض حصے یاد تھے۔ کیوں؟ اس لیے نہیں کہ ان کا حافظہ خدانخواستہ قوی نہ تھا یا ان میں حفظ یا تثبت کی صلاحیتیں پائی نہیں جاتی تھیں۔ اس لیے اور محض اس لیے کہ یہ جتنا بھی پڑھتے تھے۔ اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے اور اس پر عمل کرنا ضروری جانتے تھے۔

چنانچہ ایک صحابی کا قصہ ہے یہ آنحضرتؐ کی خدمت میں قرآن پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ جب اس آیت تک پہنچے۔

فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ـ ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره ـ

تو کہنے لگے

یکفی هذا ـ — جناب میری عملی زندگی کے لیے یہی بہت ہے۔

یہ کہا اور چل دیے۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا

الصرف الرجل فھو فقیہ ۔ کہ پلٹ کر جانے والا قرآن کے اصلی راز کو پا گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تاثر کی یہ کیفیت آسانی سے پیدا ہونے والی نہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہی تلاوت سے مقصود بھی ہے اور اس کے بغیر اس کی لذتوں سے انسان دوچار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی نہیں بلکہ تلاوت کا سرے سے صرف زبان ہلا دینے پر اطلاق ہی نہیں ہوتا تلاوت کہتے ہیں اس چیز کو کہ اس میں زبان، عقل اور قلب تینوں کا برابر کا حصہ ہو۔ یعنی زبان تو تصحیح حروف کے درپے ہو، عقل معنی پر غور کرے اور قلب تاثر کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔ قاری کا ایک مقام ترقی کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ وہ کلام الٰہی کو اپنی زبان سے نہیں سن رہا ہے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی زبان سے سن رہا ہے اور اس سے شرف تخاطب حاصل کر رہا ہے۔ یوں قرأت کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور تصور کرے۔ اور یہ سمجھے کہ اس کی نظریں اس کے جمال جہاں آرا کے لطف سے بہرہ مند ہیں۔ اور اس کی توجہ پوری طرح اس کی ذات گرامی کی طرف مبذول ہے۔ یہ مقام دعا، تضرع اور ابتہال چاہتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل سے اس حقیقت پر ایمان رکھے۔ کہ اس کا آقا و مالک اسے دیکھ رہا ہے۔ اس سے مخاطب ہے اور اپنی عنایتوں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ یہ مقام بھی تعظیم اور توجہ و فہم کا طالب ہے۔

تیسرا درجہ ان دونوں سے بلند ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ قاری آیات و کلمات میں اللہ تعالیٰ کے جلووں کو ملاحظہ کرے۔ اور اس کی صفات کی کرشمہ سازیوں اور کارفرمائیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھے۔ اس وقت اس کے سامنے نہ تو اپنی ذات ہوگی۔ اور نہ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے انعامات ہوں گے کہ اس نے ان سے کس درجہ فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ اس وقت توجہ و ہمت کی تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی ذات برتر پر مرکوز ہوں گی۔ خیال ہوگا تو اس کا اور فکر و تدبر ہوگا تو اس کے بارہ میں گویا پورے پورے استغراق سے کام لیا جائے گا۔ یہ درجہ مقربین کے ساتھ خاص ہے اور اس سے پہلے کے دو درجے اصحاب الیمین کے ساتھ مختص ہیں۔ اس کے علاوہ جو مقامات ہیں ان کو بجز سہو و غفلت کے مقامات کے اور کس مقام و درجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پہلے درجہ کے متعلق جعفر بن محمد الصادق کا کہنا ہے

لقد تجلی اللہ عزوجل فی کلامہ ولکنھم لا یبصرون۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں متجلی تو ہے۔ مگر یہ لوگ اس کی تجلیات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ ایک آیت کی تلاوت کے دوران انہیں غش آگیا۔ سبب پوچھا گیا تو فرمایا

ما زلت اردد الآیۃ علیٰ قلبی حتی سمعتھا من المتکلم بھا فلم یثبت جسمی لمعانیہ فدرتہ۔

میں بار بار اس آیت کو دہرا رہا تھا۔ تاکہ خود متکلم اور کہنے والے کے منہ سے اس کو سن سکوں۔ چنانچہ بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ لیکن اس حال میں کہ جسم اس مشاہدہ کا متحمل نہ ہو سکا

یہ وہ مقام ہے جہاں قرأت و تلاوت کی لذتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور انسان قرآن کے صحیح صحیح لطف سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔

ایک صاحب دل حکیم کا قول ہے کہ میں نے قرآن پڑھا۔ مگر اس کی فرحتوں سے محروم رہا۔ پھر اس نقطۂ نظر سے اس کی تلاوت کی کہ آنحضرت سے گویا براہ راست سماعت کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔ پھر اس مقام سے آگے بڑھا۔ اور جبرئیل کی زبان فیض ترجمان سے سننے کی کوشش کی۔ اور بالآخر وہ مرحلہ آیا۔ کہ قرآن کے اتارنے والے سے ہم کلامی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور نہ پوچھیے اس مقام کی لذتیں کیا درجہ رکھتی ہیں۔ بس اختصاراً اتنا ہی سمجھ لیجئے۔

لا اصبر عنہ۔

کہ یہاں پہنچ کر پھر جدائی کا یارا نہیں رہتا

حضرت حذیفہ نے فرمایا

لو طھرت القلوب لم تشبع من قراءۃ القرآن۔

اگر دل پاک ہوں تو قرآن سے سیر ہونے کی کبھی نوبت نہ آئے۔

یعنی اس میں کی ہر ہر لذت تشنگی کو اور بڑھاتی ہے۔ اور اگلی لذتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

۷۔ تبری یعنی پندار و زعم سے دستبرداری

آخری درجہ تبری کا ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ قاری اپنی استطاعت و طاقت کے پندار اور زعم سے یکسر علاحدگی اختیار کرے۔

اور رضائے الٰہی اور تزکیہ نفس کو اپنی تمام توجہات کا مرکز ٹھہرائے۔ حفاظ جب ایسی

آیات کی تلاوت کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے وعدے اور خوشخبریاں ہوں تو ان کا مخاطب اپنی ذات کو ہرگز نہ سمجھے بلکہ امت کے صلحاء و صدیقین کو ان کا مخاطب صحیح قرار دے۔ اور اس خواہش و آرزو کا اظہار کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی ان لوگوں میں شمار کرے۔ اور ان کے تتبع و پیروی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ جب ایسی آیات پر اس کا گذر ہو جن میں اللہ کے غضب کا تذکرہ ہو۔ اور ان لوگوں کا بیان ہو جنہوں نے دین کے معاملہ میں ہر طرح کے تساہل و کوتاہیوں کو روا رکھا ہے۔ تو اس کا مخاطب اپنی ذات کو سمجھے۔ اور بخشش و عفو میں مصروف ہو۔ یہی وہ عارفانہ گر ہے جس کی طرف عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی ایک دعا میں اشارہ کیا ہے۔

اللھم استغفرك لظلمی و کفری۔ اے خدا میں اپنے ظلم اور کفر پر معافی کا طالب ہوں۔

پوچھا گیا کہ حضرت ظلم کا اطلاق تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر یہ کفر کیا ہے؟ مسلمان اور کافر؟ فرمایا۔ کفر کے بھی درجے ہیں۔ کیا یہ آیت نظر سے نہیں گذری۔

اِنَّ الانسان لظلوم کفار۔ بے شک انسان بڑا بے انصاف اور کافر ناشکرا ہے۔

تفسیر بالرائے ــــ کہ تاویل و تعبیر کے دائروں کو صرف ظاہر تک محدود رہنا چاہیے۔

پچھلے بابوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ کہ ان میں تو فہم قرآن پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسرار و رموز قرآن کی اہمیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کی سخت وعید اس معاملہ میں آتی ہے

من فسر القرآن برایه فلیتبوء مقعده جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی۔ وہ اپنا ٹھکانا

من النار۔ جہنم میں تیار کرے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن کو اس کے ظاہر ہی پر محمول کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں مین میخ نکالنا اور نکتہ سنجی یا خواہ مخواہ کے تکلفات سے کام لینا ممنوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم کی ایک بہت بڑی جماعت نے ظاہری معانی کے بل پر اہل تصوف پر زبانِ طعن دراز کی ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے تفسیر کے نام پر وہ وہ باریکیاں پیدا کی ہیں۔ اور ایسے ایسے نکتوں کی نشاندہی کی ہے جن کا کوئی ثبوت صحابہ سے نہیں مل سکتا۔ یعنی نہ تو ابن عباس کی تشریحات میں ان کا کوئی نشان ملتا ہے۔ اور نہ عبداللہ بن مسعود ہی نے کہیں ان کی تائید کی ہے۔ اگر یہ صورت حال صحیح ہے تو سوال یہ ہے۔ کہ پھر اس فہم قرآن اور اسرار و رموز قرآن کا کیا مقام رہ جاتا ہے۔ جس کی تفصیلات سے چشم و قلب نے ابھی ابھی تسکین حاصل کی ہے۔ اور اس سے کیا مراد ہے؟

معانی اور باطن قرآن کے سلسلہ میں آثار و اقوال

ہمارا جواب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے معانی کو صرف ظاہر الفاظ میں محصور جانتا ہے۔ اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی تہہ میں بے شمار گہر ہائے یک دانہ پنہاں ہیں۔ وہ صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنی استعداد اور رسائی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں کیونکہ جہاں تک قرآن کی تعبیر اور معانی کی وسعتوں کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اخبار و آثار کا اچھا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے:

ان للقرآن ظهراً وبطناً وحداً ومطلعاً۔ — قرآن کا ایک ظاہر ہے۔ ایک باطن ہے۔ ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے۔

اسی انداز کا ایک قول عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے۔ اور یہ عبداللہ بن مسعود کون ہیں؟ تفسیر کے مسلمہ امام۔ حضرت علیؓ کا کہنا ہے

لو شئت لاوقرت سبعين بعيراً من تفسير فاتحة الكتاب۔ — میں اگر چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر پر اتنا کچھ لکھ ڈالوں کہ اس کو اٹھانے کے لیے ستر اونٹ درکار ہوں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اگر معانی کا اطلاق صرف ظواہر کے اعتبار سے ہو تو تفصیلات کا یہ پھیلاؤ کیونکر ممکن ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس درجہ علوم و فنون ہیں۔ یہ سب افعال اللہ کے حکم میں ہیں۔ اور قرآن میں جملہ افعال اللہ کی وضاحت موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقل و خرد کے جتنے اختلافی مسائل لوگوں میں دائر و سائر ہیں۔ ان سب کے بارہ میں اس میں فیصلہ کن اشارات پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کا آسانی سے گرفت میں آنا ممکن نہیں۔ ادراک، فہم اور کاوش شرط ہے۔

ظاہر ہے جو شخص صرف الفاظ کے قریب ترین اطلاقات پر غور کرتا ہے اور بجائے سمندر کی گہرائیوں کے آزمانے کے صرف ساحل ہی تک اپنے استفادہ کو محدود رکھتا ہے۔ وہ کہاں ان معانی تک پہنچ سکتا ہے۔

حدیث میں ہے

اقرءوا القرآن والتمسوا غرائبه۔ — قرآن پڑھو اور اس کے عجائب کی تلاش میں رہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا

وَالذی لیبتنی بالحق نبیا
لتفرق امتی عن اصل دینها۔
وجماعتها علی اثنتین و
سبعین فرقة کلها ضالة مضلة
یدعون الی النار فاذا کان ذالك
فعلیکم بکتاب الله عزّ و
فانّ فیه نبا من کان قبلکم
وما یاتی بعدکم وحکم ما بینکم
من خالفه من الجبابرة قصمه
الله عزوجل ومن ابتغی
العلم فی غیره اضله الله عز
وجل وهو حبل الله المتین
ونوره المبین و شفاءه
النافع عصمة لمن تمسك
به ونجاة لمن اتبعه لا یعوج
فیقوم ولا یزیغ فیستقیم
ولا تنقضی عجائبه ولا یخلقه
کثرة الترديد"[۱]۔

. . . .

اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق وصداقت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میری امت اصل دین سے ہٹ کر بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ سب خود بھی گمراہ ہوں گے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور جہنم کی دعوت دیں گے۔ جب یہ نوبت آئے۔ تو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑلو۔ اس میں تم سے پہلوں کی خبریں ہیں۔ اور ان حالات کی پیش گوئی ہے جن سے تمہیں دوچار ہونا ہے۔ اس میں تمہارے موجودہ مسائل کا بھی تذکرہ ہے۔ جابرہ اور سرکشوں میں جو بھی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا اس کی گردن ماردی جائے گی۔ اور جو اس کے سوا دوسری جگہوں سے علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردیں گے۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور واضح روشنی ہے۔ اور ایسی شفا ہے جو نعمت ہے یہ ان لوگوں کے لیے بمنزلہ پناہ گاہ کے ہے جو اس تمسک کرتے ہیں ان کے حق میں نجات کا پیغام ہے اور جو اس کی پیروی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسی سیدھی راہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ اور پیچ وخم نہیں مزید برآں اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں۔ اور نہ اس کے مطالب کثرت تلاوت سے کبھی فرسودہ ہونے والے ہیں۔

. . . .

ان تصریحات کے پہلو بہ پہلو اس حقیقت پر بھی غور کیجیے کہ ابن عباسؓ نے قرآن میں جن حکمتوں کو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام قرار دیا ہے۔ ان کو فہم قرآن سے تعبیر فرمایا ہے۔

ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا۔ (یعنی الفهم فی القرآن)

اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر سے بہرہ مند کیا گیا۔

---

(۱) ترمذی

یعنی فہم قرآن کی صلاحیتیں بخشی گئیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن فہمی کا میدان بہت وسیع ہے۔ اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے گنجائش کی بے انتہا فراوانیاں ہیں۔ اور مقصود شرع یہ نہیں کہ انسانی بصیرت کے دائرے صرف الفاظ کے ظواہر تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ اور ان کے اندر جو معانی اور نوادر کی ایک دنیا آباد ہے اس کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کی جائے۔

تفسیر بالرائے کے معنی کیا ہیں۔ تفسیر و تعبیر کے تقاضوں کو مسموعات تک محدود نہیں رکھا جا سکتا رہی یہ بات کہ آنحضرتؐ نے جو تفسیر بالرائے سے روکا ہے۔ یا حضرت ابوبکرؓ نے جو یہ فرمایا ہے

ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن برایی۔	مجھے کون زمین برداشت کرے گی۔ اور کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا۔ اگر میں قرآن میں اپنی رائے چلاؤں۔

تو اس کا محل و مورد کیا ہے۔

سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ان تصریحات سے مقصود ہے کہ تفسیر و تعبیر کی کوششیں صرف منقولات و مسموعات تک محدود رہیں تو یہ بوجوہ ممکن نہیں۔

کیونکہ اگر مسموعات سے مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے منقول و مروی ہوں تو بہت ہی محدود ہیں۔ ان سے کسی طرح بھی تفسیر قرآن کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ اگر مسموعات کا دائرہ صحابہ تک وسیع ہے تو یہ بھی قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ صحابہ بھی تو آخر انسان ہی ہیں۔ ان کی رائے پر کیونکہ تفسیر بالرائے کا اطلاق نہ ہوگا۔ پھر جو لوگ صحابہ کی تفاسیر پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان میں معنی و تعبیر کا بے حد اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ ان کے سامنے استدلال کے لیے صرف مسموعات و منقولات کا ذخیرہ نہ تھا ورنہ اختلاف تفسیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ ان میں کے ہر ایک نے قرآن کے معانی میں غواصی کی ہے۔ اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس بحر بے کراں سے اخذ مطالب کیا ہے اور یہ حدیث تو فضائل ابن عباسؓ کے سلسلہ میں خاص شہرت رکھتی ہے۔

دعا لابن عباس رضی اللہ عنہ	آنحضرتؐ نے حضرت ابن عباس کے حق میں دعا فرمائی

وقال اللھم فقہ فی الدین کہ اے اللہ۔ اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر۔ اور تاویل
وعلمہ التاویل۔ کے اسرار کا محرم بنا۔

اب اگر تاویل الفاظ و منقولات تک ہی محدود ہوتی اور اس کے دائرے معنی کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے نہ ہوتے تو اس دعا و تخصیص کا کوئی مطلب ہی نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں ارشاد ربانی ہے
لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم (النساء ۸۳) تو استنباط کرنے والے اس کی حقیقت کو پالیتے۔
صرف سماع و نقل کا استنباط اور تقاضے اور گہرائیاں اس میں شامل ہیں —— تفسیر بالرائے کے دو محل

جس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالی نے استشہاد و استدلال کا ذکر مقام مدح میں کیا ہے جو کھلا ہوا ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ فعل دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس لیے اس سے روکنا اور باز رکھنا کیونکر ممکن ہے۔ پھر استنباط کا لفظ یہ بھی بتا رہا ہے کہ یہ مجرد سماع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سماع سے قطعی مختلف چیز ہے جو معنی و باطن سے متعلق ہے ظاہر و سطح سے نہیں۔ اب ان تصریحات پر غور کریں جن میں تفسیر بالرائے سے روکا گیا ہے۔ اور مورد و محل متعین کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری رائے میں اس کے دو محل ہو سکتے ہیں۔ (۱) یہ کہ کوئی شخص پہلے سے کوئی رائے رکھتا ہو۔ اور پہلے سے کسی نظریہ کی صحت کا قائل ہو۔ اور تفسیر سے اس کی غرض محض یہ ہو کہ اپنے حسب منشا آیات تلاش کرے۔ اور اس نظریہ و رائے کے مطابق ان کی تشریح کرے۔ نیز اپنے رجحانات و میلانات نفس کے لیے قرآن کی تائید و نصرت چاہے۔ یہ فعل یقیناً برا ہے اور کوئی شخص بھی اس انداز تفسیر کو جائز نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو محض جہل اس کا باعث ہوگا۔ یعنی ایک آیت کے فرض کیجیے دو معنی منقول ہیں۔ تو وہ ازراہ نادانی ان میں سے اس معنی کو اختیار کرے گا جو اس کی رائے کے مطابق ہو۔ اگرچہ نفس تاویل کے اعتبار سے وہ مرجوح ہو اور دوسرا معنی زیادہ قوی ہو۔ اور یا جانتے بوجھتے وہ غلط تاویل کو اس بنا پر پسند کرے گا تاکہ اپنے حریف کو شکست دے سکے۔ اور اپنے رجحان و عقیدہ کی صحت ثابت کر سکے۔

اس انداز کی تاویلات باطلہ متعدد ہیں۔ مثلاً سحری کے بارہ میں حدیث ہے
تَسَحَّرُوْا فان فی السحور برکۃٌ۔ سحری ضرور کھاؤ اس میں برکت ہے۔
اب اگر کوئی شخص کہتا ہے تسحروا سے مراد سحری کھانا نہیں بلکہ اللہ کا ذکر ہے۔ تو تفسیر بالرائے

ہو گی۔

موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ کے لیے مبعوث فرمایا۔ اور یہ حکم دیا

اذھبا الیٰ فرعون انہ طغیٰ ۔ اور فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکش ہو رہا ہے۔

اس پر اگر کسی صوفی صافی نے از راہ موشگافی و نکتہ سنجی یہ کہہ دیا کہ فرعون سے مراد انسان کا دل ہے۔ کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کون سرکش ہو سکتا ہے۔ تو یہ تاویل منشاء قرآن کے منافی ہو گی اور تفسیر بالرائے کہلائے گی۔ یہ انداز دراصل ان واعظوں کا ہے جو مجالس کو گرمانے کے لیے اور جہلا پر اپنا رعب گانٹھنے کے لیے اس قسم کی تاویلات فاسدہ سے کام لیتے ہیں۔ یا یہ باطنیہ کا خاص ڈھنگ ہے جس کے ذریعہ یہ حقائق دینیہ کو ختم کرتے ہیں۔

(۲) قرآن حکیم کا اپنا ایک انداز بیان ہے جو زبان عربی کے اعلیٰ ترین تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس میں کہیں اختصار ہے۔ کہیں حذف ہے۔ کہیں اضمار سے کام لیا گیا ہے۔ پھر کہیں تقدم ہے کہیں تاخر ہے۔ ظاہر ہے اس مرحلہ پر تعیین معنی کے لیے سماع اور منقولات کی مدد لی جائے گی۔ ورنہ سخت غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ اب اگر کوئی شخص ان صحیح روایات کی پروا نہیں کرتا جو معنی و تاویل کی حقیقتوں پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔ اور آیات کے ضروری پس منظر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور صرف عربیت کے بل بوتے پر۔ ان کی تاویل کر پاتا ہے۔ اور اس قیمتی ذخیرۂ احادیث و آثار کی قدر و قیمت گھٹاتا ہے جس سے مشکلات قرآن کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ اور چہرۂ معانی کی جلا بڑھتی ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس احمق کی سی ہے کہ جو گھر کے وسط تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر صدر دروازے سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ دو صورتیں ہیں جن پر تاویل بالرائے کا صحیح صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ نے انہیں دو صورتوں سے روکا ہے۔ ورنہ معانی میں غور و خوض ایسی چیز نہیں کہ ظاہر معنی کی اس میں مخالفت پائی جائے۔ بلکہ یہ تو ایک طرح سے الفاظ و ظواہر ہی کی مدد سے مغز و باطن یا عطر و روح تک پہنچنا ہے۔